بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

کئی سال کی پے درپے مایوسیوں کے بعد اب پھر یہ توقع قائم ہوئی ہے کہ ہمارے ملک کو ایک ایسا دستور مل جائے گا جسے کم ازکم بنیادی طور پر اسلامی کہا جا سکے۔ اگرچہ مختلف رجحانات کی موجودگی اور ان کی کشمکش نے اس امر کے موقع باقی نہیں چھوڑے ہیں کہ یہاں پہلے ہی مرحلے میں ایک خالص اور مکمل اسلامی نظام حکومت قائم ہو سکے، لیکن بحالتِ موجودہ یہ بھی بہت غنیمت ہو گا کہ ہماری سمتِ سفر جو اب تک لادینی کی طرف تھی، اب بدل کر اسلام کی طرف مڑ جائے اور ہم پہلا قدم صحیح رُخ پر اُٹھا سکیں۔ اس کے بعد اگر مسلسل اور پیہم جدوجہد جاری رکھی جائے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آخر کار ہم اپنی ریاست کو ایک مکمل اور مثالی ریاست بنانے میں انشاءاللہ کامیاب ہو جائیں گے۔

---

اس موقع پر جو بات عوام اور حکومت، سب کے ذہن نشین ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ دستور کسی تعویذ کا نام نہیں ہے جس کو ریاست کے گلے میں باندھ دینے سے سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جائے۔ دستور میں ہم خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقاصد اور پاکیزہ اصول درج کر دیں، اُن سے عملاً کوئی فرق واقع نہ ہو گا جب تک کہ حکومت اور حکام اور باشندگانِ ملک سب کے سب مل جل کر معاشرے کی اصلاح، اور خصوصاً معاشرے کے اخلاق کی تعمیر کے لیے کوشش نہ کریں۔ ہم ایک ناقص دستور سے بھی بہترین نتائج پیدا کر سکتے ہیں اگر ہماری نیت بخیر ہو اور ہم سب کا ارادہ اسلام کی بہترین رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر اپنی حالت درست کرنے کا ہو۔ اس کے برعکس کوئی کامل و مکمل دستور بھی، خواہ وہ سو فی صدی اسلامی ہو، محض اپنے الفاظ کی طاقت سے کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا، بلکہ ہم اپنے اخلاق کی خرابی اور اپنے اعمال کی شومی سے اس کو ناکام کر کے دنیا بھر میں اپنے ساتھ خود اسلام کی رسوائی کا سامان بھی کر دینگے۔ دستور کو صحیح اصولوں پر قائم کرنا بلاشبہ ضروری ہے تاکہ ایک صالح معاشرے کی تعمیر میں

اس کے نقائص رکاوٹ نہ بن سکیں۔ لیکن دستور کی اصلاح کے بعد معاشرے کی اصلاح کے لیے عملی سعی بھی اتنی ہی، بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ ایک بداخلاق معاشرہ اپنے لیے بھی مصیبت ہے اور اس حکومت کے لیے بھی جو اس کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالے۔ کوئی بہتر سے بہتر قانون و دستور بھی ایسے معاشرے میں کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

---

اس معاملے میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے حکومت پیش قدمی کرے۔ اُسے محض نظم و نسق چلانے والی حکومت بن کر نہ رہنا چاہیے بلکہ معاشرے کی تعمیرِ صالح کو اپنا نصب العین بنا کر کام شروع کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں مدتِ دراز سے ایک ایسی حکومت قائم تھی جس کے نظریات ہم سے مختلف تھے، جس کو ہماری صلاح و فلاح سے کوئی حقیقی دلچسپی نہ تھی، اور جس کے ساتھ ہم بھی کوئی ہمدردی و خیراندیشی نہ رکھتے تھے۔ اس کے پیشِ نظر صرف امن و انتظام کو بحال رکھنا اور اپنے نظم و نسق کو بخوبی چلاتے رہنا تھا۔ معاشرے کی تعمیر کے لیے نہ وہ کوشش کرنا چاہتی تھی، نہ کر سکتی تھی اور نہ ہم یہ گوارا کر سکتے تھے کہ باہر کے فرمانروا ہماری زندگی میں کچھ زیادہ مداخلت نہ کریں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ تعمیر سے زیادہ تخریب کا موجب ہوا۔ اور اپنے نظم و نسق کو چلانے میں انہوں نے جو طریقے اختیار کیے اُن کے انتخاب میں نظم و نسق کی کامیابی وہ اصل چیز تھی جو ان کے پیشِ نظر رہی۔ اس بات کی انہیں کوئی پروا نہ تھی کہ ان طریقوں سے ہمارے اخلاق بنتے ہیں یا بگڑتے ہیں۔ اب اگر ہماری قومی حکومت بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس اجنبی حکومت کی خلفُ الصدق ہی بنی رہے، اور اُسی کی طرح بس اپنا نظم و نسق چلانے سے غرض رکھے، اور اُس کے لیے انہی طور طریقوں سے کام لیتی رہے جو اس کی پیش رو حکومت نے جاری کیے تھے، تو ہم قیامت تک کسی تعمیرِ نو کی امید نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر معاشرے کی اصلاح کے لیے کچھ غیر سرکاری عناصر کوشش بھی کریں اور خود معاشرے کے افراد بھی اپنی اصلاح کے خواہشمند ہوں، تب بھی حکومت کے غلط طور طریقے اُن کو اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایک طرف حکومت اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر نئی تدبیریں اختیار کرے اور دوسری طرف معاشرے کے اصلاح پسند عناصر کا پورا تعاون اس کام میں اسے حاصل ہو۔

حکومت کی صحیح تدابیر معاشرے کو کس طرح بناتی، اور غلط تدابیر اسے کس طرح بگاڑتی ہیں، اس کو ہم ایک متعین مثال سے واضح کریں گے۔

---

عرب میں اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے لوگ اس بات سے قطعاً خوگر نہ تھے کہ کوئی باقاعدہ حکومت ان پر ٹیکس لگائے اور وہ اپنے اموال میں سے ایک حصہ نکال کر اس کے حوالہ کر دیں۔ اس ماحول میں اسلام نے پہلی مرتبہ ان پر زکوٰۃ عائد کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وصولی کے لیے عاملین صدقہ (تحصیلدار) مقرر کیے۔ یہ کام اگر محض نظم و نسق چلانے کے ڈھنگ پر کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ سخت خونریز لڑائیوں کے بعد ہی لوگ زکوٰۃ دینے پر آمادہ کیے جا سکتے اور ایک ایک بستی اور ایک ایک چراگاہ پر زکوٰۃ کی وصولی کے لیے فوج اور پولیس کے مضبوط دستے بھیجنے پڑتے۔ لیکن جو حکمرانی اصلاح معاشرہ کے نقطۂ نظر سے کی جا رہی تھی اس نے اس کام کے لیے جو تدبیریں اختیار کیں اور پھر ان سے جو نتائج حاصل کیے وہ حیرت انگیز بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی کہ یہ زکوٰۃ دنیوی بادشاہیوں کے باج و خراج کی طرح نہیں ہے بلکہ ایک عبادت ہے جسے ادا کرنا تم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز، روزہ اور حج فرض ہے۔ یہ مال میری جیب میں نہ جائے گا، بلکہ اس میں سے کچھ کھانا مجھ پر اور میری آل اولاد پر حرام ہے۔ یہ تمہارے مالداروں سے لیا جائے گا اور تمہارے ہی حاجت مندوں پر خرچ کیا جائے گا۔ حکومت اس خدمت کی انجام دہی کا جو انتظام کرے گی اس کا صرف واجبی خرچ وصول شدہ اموال میں سے لیا جائے گا۔ اس طرح محض تعلیم و تلقین سے اُن لوگوں کے ذہن ادائیگی زکوٰۃ پر راضی کر لیے گئے جو سخت خون خچر کے بغیر کبھی اسے قبول کرنے والے نہ تھے۔ اور اس آمادگی میں بہت بڑا دخل اُس فرمانروا کی سیرت کا تھا جو ان سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ اس کی سیرت ہی نے لوگوں میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی کیا بھی جائے گا۔

---

اس کے ساتھ حضور نے جو تحصیلدار تیار کیے ان کو صرف تحصیل وصول کی ٹریننگ ہی نہیں دی بلکہ ان کی

اخلاقی تربیت بھی فرمائی۔ آپ نے اُن کو بتایا کہ زکوٰۃ کی تحصیل کے لیے نکلنا جہاد فی سبیل اللہ کا حکم رکھتا ہے اور جہاد ہی کا ثواب تم کو ملے گا بشرطیکہ یہ کام حق کے ساتھ کرو (العامل علی الصدقۃ بالحق کالغازی فی سبیل اللہ حتی یرجع الی بیتہ۔ ابو داؤد)۔ آپ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ زکوٰۃ کی تحصیل میں زیادتی کرنے والا اتنا ہی بڑا گناہ گار ہے جتنا زکوٰۃ نہ دینے والا، بلکہ اس کی زیادتی ہی اس بات کی موجب ہوگی کہ لوگ زکوٰۃ نہ دینے کا گناہ کرنے لگیں (المعتدی فی الصدقۃ کمانعھا، ترمذی و ابو داؤد)۔ آپ نے ان کو ہدایت کی کہ زکوٰۃ میں لوگوں کے عمدہ مال چھانٹ چھانٹ کر نہ لیں اور مظلوم کی بددعا سے بچ کر رہیں، کیونکہ اُس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا (ایاک وکرائم اموالھم واتق دعوۃ المظلوم فانھا لیس بینھا وبین اللہ حجاب، رواہ الجماعۃ)۔ آپ نے ان کو یہ آداب بھی سکھائے کہ جس سے زکوٰۃ وصول کرو اس کے حق میں دعائے خیر کرو۔ اس دعائے خیر نے تحصیلداروں اور ٹیکس گزاروں کے تعلق کی اُس کیفیت کو بالکل ہی الٹ دیا جو دنیوی حکومتوں میں پائی جاتی ہے۔ دنیا کا دستور تو یہ تھا اور ہے کہ تحصیلدار ٹیکس گزاروں کو گالیاں دیتا ہے اور ٹیکس گزار جواب میں اسے گالیوں اور کوسنوں سے یاد کرتے ہیں۔

---

دوسری طرف آپ نے ٹیکس گزاروں کو جو ہدایات دیں وہ یہ تھیں کہ خدا کی راہ میں بُرا مال چھانٹ کر نہ دو۔ تحصیلدار جو کچھ مانگیں وہ ان کے حوالہ کر دو اور ان سے اپنا مال نہ چھپاؤ۔ تحصیلدار کو مطمئن کیے بغیر تم ادائیگی زکوٰۃ کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ وہ خواہ ظلم کرے یا عدل، تمہیں اس کا مطالبہ پورا کرنا ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا سیأتیکم رکب مبغضون فاذا جاؤکم فرحبوا بھم وخلوا بینھم وبین ما یبتغون فان عدلوا فلانفسھم وان ظلموا فعلیھا وارضوھم فان تمام زکوتکم رضاھم۔ "تمہارے پاس وہ لوگ آئیں گے جن کا آنا تمہیں ناگوار ہوگا، مگر تم ان کا خیر مقدم کرنا اور جو کچھ وہ لینا چاہیں وہ ان کے حوالے کر دینا۔ وہ عدل کریں گے تو ان کے اپنے لیے بہتر ہے اور ظلم کریں گے تو وہ خود اس کا وبال بھگتیں گے، تم بہرحال ان کو مطمئن کرو، کیونکہ تمہاری زکوٰۃ کی تکمیل ان کے اطمینان ہی پر موقوف ہے"۔ لوگوں نے پوچھا کہ زکوٰۃ کے تحصیلدار ہم پر زیادتی کریں تو کیا ہم ان کی زیادتی کے بقدر اپنے مال اُن سے

چھپا سکتے ہیں ؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں ۔

پھر زکوٰۃ کے جو قواعد آپ نے مقرر فرمائے ان میں حق اور انصاف کا پورا لحاظ تھا، تاکہ زکوٰۃ کی تشخیص وتحصیل میں لوگوں پر کوئی ایسی زیادتی نہ ہو جو ادائیگی زکوٰۃ سے جی چرانے کی محرک بن سکے ۔

---

اس انتظامی پالیسی نے تھوڑی ہی مدت میں یہ حالت پیدا کر دی کہ بہت تھوڑے خرچ پر بغیر کسی جبر یا مظاہرۂ قوت کے مملکت کی پوری زکوٰۃ بڑی سہولت سے وصول ہونے لگی ۔ زکوٰۃ نہ دینے یا کم دینے کے واقعات قریب قریب ناپید ہو گئے ۔ ایک محصل کسی لاؤ لشکر کے بغیر صحرا در صحرا کی بستیوں اور چراگاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور زکوٰۃ وصول کر کے لے آتا تھا ۔ کسی جھگڑے کی نوبت نہ آتی تھی ۔ بلکہ جھگڑا اُلٹا اس بات پر ہوتا تھا کہ لوگ حکومت کے واجبی حق سے زیادہ دینا چاہتے تھے اور محصل لینے سے انکار کرتے تھے ۔ مسند احمد ابو داؤد میں یہ قصہ بیان ہوا ہے کہ حضرت اُبَیؓ بن کعب زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ایک گلہ بان کے ہاں پہنچے اور اس کے اونٹوں کو دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس پر صرف ایک بنتِ مخاض (ایک سال کی عمر کا بچۂ شتر) واجب ہے ۔ گلہ بان نے کہا یہ نہ دودھ دے نہ سواری کے کام آئے، اس کے بجائے یہ جوان موٹی تازی اونٹنی حاضر ہے ۔ حضرت اُبَیؓ نے کہا اس کے لینے کا تو میں مجاز نہیں ہوں ۔ آخر کار وہ شخص اس اونٹنی کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور اپنی درخواست پیش کی ۔ حضور نے فرمایا واجب تو وہی ہے جو تمہیں بتا دیا گیا تھا، لیکن اگر تم اللہ سے اجر پانے کے لیے یہ اونٹنی دیتے ہو تو میں قبول کر لوں گا ۔ اس نے کہا یہ حاضر ہے، لے لیجیے ۔ چنانچہ وہ آپ نے لے لی اور اس کے حق میں برکت کی دعا فرمائی ۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک گلہ بان نے اپنے گلے میں سے بہترین اونٹنی نکال کر زکوٰۃ میں پیش کی اور تحصیلدار سے کہا کہ میں اپنا سب سے اچھا جانور دینا چاہتا ہوں، مگر تحصیلدار نے لینے سے انکار کر دیا ۔ وہ ایک اور جانور چھانٹ کر لایا اور تحصیلدار نے اسے بھی قبول نہ کیا ۔ تیسری مرتبہ جو جانور

وہ لایا اسے تحصیلدار نے لے تو لیا مگر کہا کہ میں اب بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرمائیں کہ تم ایک شخص کا اچھا مال چھانٹ لائے ہو (احمد۔ ابوداؤد۔ نسائی)۔

یہ نتائج ہیں اُس نظم و نسق کے جو اخلاقی اصلاح کو حکمرانی کا بنیادی ذریعہ بنا کر کام کرتا ہے۔ اس کی تدابیر ایک طرف کم سے کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرتی ہیں اور دوسری طرف معاشرے کے اخلاقی معیار کو اتنا بلند کر دیتی ہیں کہ حکومت اور رعیت، دونوں ایک دوسرے پر پوری طرح اعتماد کر کے کامل اطمینان اور باہمی خیر سگالی کی فضا میں اپنا کام کر سکتے ہیں۔

---

اب ذرا اُس حکومت کا حال دیکھیے جو اخلاق کی فکر کیے بغیر محض نظم و نسق چلانے کی کوشش کرتی ہے۔ اُوپر چونکہ ہم نے زکوٰۃ کو مثال میں پیش کیا تھا اس لیے یہاں ہم انکم ٹیکس کو مثال میں لیتے ہیں۔ ایک مدت سے اس معاملہ میں حکومت اور ٹیکس گزاروں کے درمیان آنکھ مچولی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل رہا ہے۔ حکومت ٹیکس عائد کرنے اور اس کو وصول کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کرتی گئی وہ لوگوں میں ٹیکس سے بچنے کی ذہنیت پیدا کرتے اور زیادہ سے زیادہ بڑھاتے چلے گئے۔ حکومت نے اس کا مداوا یہ سوچا کہ ٹیکس گزار جو حساب پیش کریں اس کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے اور انکم ٹیکس کے حکام بغیر کسی ثبوت اور تحقیق کے خود جس قدر چاہیں ایک شخص کی آمدنی تجویز کر کے اس پر ٹیکس عائد کر دیں۔ لوگوں نے اس کے جواب میں بے تحاشا جھوٹے حساب رکھنے شروع کر دیئے اور افسروں نے بیچ میں سے رشوت خوری کے وسیع مواقع نکال لیے۔ اب حالت یہ ہے کہ ۹۰ فی صدی سے بھی زیادہ کاروباری لوگ جھوٹے حساب پیش کرتے ہیں اور انکم ٹیکس کے افسر باقاعدہ سرکاری ہدایات کے تحت لازماً ہر ٹیکس گزار کو جھوٹا سمجھ کر اس کے پیش کردہ حساب سے زائد، بلکہ بسا اوقات کئی کئی گنا زائد ٹیکس تجویز کر دیتے ہیں (اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حساب پیش کرتے وقت ہر شخص سے حلف لیا جاتا ہے کہ اس کا حساب سچا ہے اور پھر اسے جھوٹا قرار دیا جاتا ہے)۔ اس حالت میں جو تھوڑے سے بہت کاروباری آدمی ہمارے معاشرے میں ایسے رہ گئے ہیں جو سچے حساب رکھنا اور واجبی ٹیکس ادا کرنا چاہتے ہیں، وہ بھی جھوٹ پر مجبور ہوتے چلے جا رہے ہیں، کیونکہ وہ خواہ سو فی صدی سچے حساب

رکھیں، انکم ٹیکس آفیسر بہرحال ان کو جھوٹا ہی قرار دیتے ہیں اور ان پر اتنا ہی زائد ٹیکس لگا دیتے ہیں جتنا جھوٹے حساب والوں پر لگایا جاتا ہے۔ اس طرح سچے لوگوں کا سارا منافع ہی نہیں بلکہ اصل سرمایہ بھی مارا جاتا ہے اور ان کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یا تو کاروبار بند کر دیں یا خود بھی جھوٹے لوگوں میں جا شامل ہوں۔

---

انتظامی حیثیت سے یہ پالیسی اس لحاظ سے ناکام ہے کہ ملک کا حقیقی انکم ٹیکس کبھی پورا وصول نہیں ہوتا اور حکومت کو اسی آمدنی پر قناعت کرنی پڑتی ہے جو چھین جھپٹ سے وصول ہو جائے۔ پھر یہ کم آمدنی بھی بہت زیادہ مصارف سے حاصل ہوتی ہے۔ اور مزید براں اس پالیسی کی بدولت سرکاری عملہ میں لازماً بددیانتی پرورش پاتی ہے۔ اس لیے محض نظم و نسق چلانے کے نقطۂ نظر سے بھی یہ صورتِ حال کسی طرح اطمینان بخش نہیں ہے۔ دوسری طرف معاشرے پر اس کا جو اثر پڑ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ملک کا پورا کاروباری طبقہ جھوٹ، بے ایمانی اور دروغ حلفی کی وبائے عام میں مبتلا ہو رہا ہے۔ اور جو بچا کھچا ایک ایماندار عنصر ہماری آبادی میں باقی رہ گیا ہے اس کے لیے بھی اپنے اخلاق کو بچانا محال بلکہ غیر ممکن ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک اجنبی حکومت تو اس بات سے بے پروا ہو سکتی تھی کہ جس قوم پر وہ حکومت کر رہی ہے وہ اخلاقی حیثیت سے گرتی ہے یا اٹھتی ہے، مگر کیا ایک قومی حکومت کو بھی اس معاملہ میں بے حس رہنا چاہیے؟ ایک قومی حکومت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چیز خطرناک ہو سکتی ہے کہ جس معاشرے پر اس کی طاقت کا سارا دارومدار ہے وہ اخلاقی حیثیت سے بالکل ناقابلِ اعتماد ہو؟ معاشرہ ہی تو ریاست کی جڑ بنیاد ہے۔ یہ بنیاد اگر کمزور ہو تو اس پر ایک طاقت ور ریاست کی عمارت کیسے کھڑی رہ سکتی ہے۔ یہ وہ سوال ہے جس پر ہماری حکومت کے کارفرماؤں کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور نئی پالیسی اس طرح بنانی چاہیے کہ نظم و نسق بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ چلے اور اس کے ساتھ وہ معاشرے کو بگاڑنے کے بجائے بنانے کا ذریعہ بھی بن سکے۔

---

جیسا کہ ہم نے اوپر انکم ٹیکس کی مثال میں بتایا ہے، ایک غلط انتظامی پالیسی حکومت اور معاشرے دونوں کو بدی کے چکر میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس کی ہر گردش دونوں طرف بدی کو بڑھاتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ (بقیہ ۳۲۶ پر)

## (بقیہ اشارات)

معاشرے میں کسی صالح عنصر کا بقا بھی ممکن نہیں رہتا۔ اس چکر کو توڑنا ضروری ہے اور اس کے توڑنے کی ابتدا بہرحال حکومت کی طرف سے ہونی چاہیے۔ وہ ابتدا نہ کرے تو معاشرے کا کوئی غیر سرکاری عنصر اصلاحِ حال کے لیے کچھ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے قواعد ہر شخص کو راستی سے انحراف پر مجبور کر دیتے ہیں۔ البتہ اس کی طرف سے اصلاح کا آغاز ہو تو قوم ابھی اتنی بے جان نہیں ہے کہ اس سے جوابی تعاون کی امید نہ کی جا سکے۔ انکم ٹیکس ہی کے معاملے کو لیکر مثال کے طور پر ہم بتاتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے اس چکر کو توڑنے کی ابتدا کس طرح ہو سکتی ہے اور پبلک کی طرف سے تعاون کی کیا شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔

(۱) نئے دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی مؤثر انداز میں کاروباری طبقے سے عام اپیل کی جائے کہ وہ اپنے حسابات ایمانداری کے ساتھ رکھیں اور اپنی قومی حکومت کے ساتھ راستبازی سے معاملہ کریں۔ وہ اگر اپنی روش بدل دیں تو حکومت بھی ان کو راستباز تسلیم کرتے ہوئے ان سے معاملہ کریگی اور کسی کے سابق رویہ کو اس کے خلاف حجت نہ بنایا جائے گا۔

(۲) انکم ٹیکس کی حد سے بڑھی ہوئی شرحوں پر نظر ثانی کی جائے، کیونکہ وہ لوگوں کے لیے جعلی حسابات رکھنے اور حقیقی آمدنی چھپانے کا ایک بڑا محرک ہیں نیز کم سے کم آمدنی جس پر ٹیکس نہیں لگتا اُس کا نصاب بڑھایا جائے۔ زکوٰۃ اور خیرات کی رقوم کو اخراجات میں شمار کیا جائے اور زیادہ عیالدار آدمیوں کو ذاتی اخراجات کے معاملہ میں زیادہ الاؤنس دیا جائے۔ ظاہری حساب کے لحاظ سے تو اس طرح حکومت کی آمدنی کم ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن اگر لوگ ایمانداری کے ساتھ ٹیکس ادا کرنے لگیں تو ان رعایتوں کے باوجود آمدنی زیادہ ہونے کی امید ہے۔

(۳) حکومت کی اس اپیل کو مؤثر بنانے کے لیے ریڈیو، پریس اور پلیٹ فارم سے اخلاقی تبلیغ کی ایک مہم شروع کی جائے اور لوگوں میں راستبازی کی حس بیدار کرنے کے لیے پیہم سعی کی جاتی رہے۔

(۴) ہر جگہ کاروباری طبقوں کی مقامی انجمنیں منظم کی جائیں جو اس بات کا ذمہ لیں کہ اپنے اپنے پیشے کے لوگوں کو صداقت و دیانت پر آمادہ کرینگی، اور غلط روش اختیار کرنے والوں پر اخلاقی دباؤ ڈالیں گی۔

(۵) انکم ٹیکس کے حکام کو ہدایت کی جائے کہ وہ ہر شخص کو جھوٹا فرض کر کے اندھا دھند ٹیکس نہ لگائیں، بلکہ ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں جن کی صداقت پر شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔

اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں حکومت کس طرح اصلاح کا آغاز کر سکتی ہے اور اس میں پبلک کا تعاون کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔